انیسیوں اور بیسویں صدی میں ہندوستان کا تعلیمی منظر نامہ اور اقبال کا نقطۂ نظر

شیراز زیدی*

اگرچہ مسلمان بہت پہلے سرزمین ہند پر قدم رکھ چکے تھے اور اہل ہند کے ساتھ ان کے روابط مختلف صورتوں میں قائم تھے۔ تاہم ۱۲۰۶ء میں سلطنتِ دہلی کا قیام عمل میں آنے کے بعد ہندوستان کے دروازے باقاعدہ طور پر اسلامی تہذیب کے لیے وا ہو گئے جو دراصل خود عرب و عجم کی مختلف تہذیبوں کے محسنات کا مرقع تھی۔ دوسری طرف ہندوستان کی پختہ تہذیب جس سے اسلامی تہذیب و تمدن کا سامنا ہوا، وادیِ سندھ، آریائی ویدک، شمالی مغربی سرحد سے آنے والے یونانی اثرات، کشان، شاک، مقامی غیر آریا نیم مہذب قبائل اور دوسری غیر ملکی اقوام کے توسط سے ہندوستان پہنچنے والے عناصر کے اشتراک عمل کا نتیجہ تھی۔ دونوں تہذیبوں کے بنیادی ڈھانچے میں اثر و قبول کی گنجائش موجود تھی۔ چناں چہ جب سیاسی و سماجی سطح پر روابط بڑھے تو رفتہ رفتہ ایک ہند اسلامی تہذیب کا خاکہ برصغیر میں ابھرنے لگا جو دونوں تہذیبوں کے سماجی و سیاسی تجربات کی مشترکہ مرہونِ منت تھی۔

دراصل نظامِ مملکت چلانے کے لیے مسلمان حکمرانوں کو ہر میدان میں مقامی لوگوں کی ضرورت تھی۔ مسلمان حکمرانوں کے ساتھ معمار، اہل کار اور محاسب نہیں آئے تھے۔ لہٰذا عمارتیں ہندو معماروں نے تعمیر کیں جن کی وجہ سے قدیم ہندوستانی فن تعمیر میں نئے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں ناگزیر ہو گئیں۔ سکے ڈھالنے کا کام ہندوستانی سناروں نے کیا۔ حساب کتاب کا ذمہ ہندو عہدے داروں کا تھا۔ قانون دان ہندوؤں نے ہندو قوانین کے نفاذ کے بارے میں تجاویز دیں غرض اس طرح ایک ایسی تہذیب کی ابتدا ہو گئی جسے نہ پورے طور پر اسلامی کہا جاسکتا ہے نہ ہندو، یہ ایک مشترکہ سماجی و سیاسی روابط کا نتیجہ تھی جسے بجا طور پر ہند اسلامی تہذیب کا نام دیا جاسکتا ہے۔

ہند اسلامی تہذیب کو شاہی محل کی تقریبات، میلوں ٹھیلوں، ولادت، اموات اور شادی بیاہ کی رسموں، پتنگ بازی، مختلف جانوروں کی لڑائیوں، رہس، نٹوں اور مداریوں کے تماشوں، چوسر، شطرنج، گنجفہ، بٹیر بازی، کبوتر بازی، تاش جیسے کھیلوں، فارسی اور مقامی زبانوں کے شعر و ادب، تصوف، نجوم، فلکیات، رمل، اوہام پرستیوں،

* ریسرچ اسکالر و انچارج شعبۂ اقبال اسٹڈیز، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد

مزارات کی ریت رسموں، لباس، زیورات، ہار سنگار کے لوازمات، مختلف کھانوں، مشروبات، پان، حقہ، بیڑی، وغیرہ سے باآسانی شناخت کیا جاسکتا ہے۔ عمارت سازی، مصوری، ادب، سائنس، طب ہر میدان میں اس تہذیب نے نفوذ کر لیا تھا۔ تعمیرات کو دیکھیے تو ہندو محلات، مندر اور دوسری عمارتیں بھی خالص ہندو طرز کی نہیں رہی تھیں۔ ان میں ایک نئی روح کارفرما تھی۔ مسجدوں، مقبروں میں بھی ایک ہندوستانی رنگ نظر آتا ہے۔ مصوری میں بھی کہیں زیادہ تبدیلی آئی۔ اس میں کئی طریقے اور طرزیں وجود میں آئیں۔ ادبی میدان میں اردو وجود میں آئی اور ایک نئے ادبی طرز تناظر کا آغاز ہوا۔ علمی سطح پر دیکھیں تو اگرچہ ہندو ریاضی، نجوم اور طب میں خاصی ترقی کر چکے تھے اور ان علوم سے استفادے میں علمائے عرب و عجم کے مرہونِ منت تھے تاہم عرب مسلمانوں نے یونانی علوم بھی حاصل کر رکھے تھے اور ان کو ترقی بھی دی تھی۔ لہٰذا مسلمان جب آئے تو اپنا سائنسی نظام بھی ساتھ لائے۔ ہندوؤں نے ان میں سے کچھ عناصر کو اپنا لیا۔

محمد عمر، کسب و فیض کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ہندو منجموں نے نئی فنی اصطلاحیں اخذ کیں۔ مثلاً مسلمانوں کا طول بلد اور عرض بلد ناپنے کا طریقہ اور زیچ کی بہت سی اصطلاحیں۔ مہاراجہ جے سنگھ (۱۶۸۶۔۱۷۴۳ء) نے ہندو علم زیچ کی اصلاح کا کام سرانجام دیا۔ اس نے جے پور متھرا، دہلی اور بنارس میں رصد گاہیں قائم کیں۔ اس کے درباری پنڈتوں نے عربی سے المجسطی نامی کتاب کا سنسکرت میں ترجمہ کیا اور زیچ محمد شاہی کی ترتیب میں الغ بیگ، ناظر الدین طوسی، الگر گان، جمشید کاشی اور دوسرے نجومیوں کے فلکیاتی جدول (Astronomical tables) کا استعمال کیا۔ ہندوستانی علم طب نے مسلمانوں سے فلزاتی تیزاب (Metallic acid) اور Latro Chemistry کے طریقے اخذ کیے۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے جن دست کاریوں اور صنعتوں کو رائج کیا اور ترقی دی، ان میں کاغذ بنانا، بُنے جانے والے مختلف قسم کے کپڑے، منبت کاری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔[1]

تاہم علمی اور معاشی سطح سے کہیں زیادہ یہ تبدیلیاں سیاسی اور سماجی سطح پر رونما ہوئیں اور برصغیر میں آج بھی یہ تہذیب و تمدن پوری طرح رچا بسا ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز تک دیسی نظام تعلیم رائج رہا۔ اس زمانے میں دیسی تعلیمی اداروں کی چار اقسام نظر آتی ہیں۔ ابتدائی مدرسے جن میں ۱۔ فارسی کے مدرسے ۲۔ ایسے مدرسے جن

میں ہندوستان کی جدید زبانیں ذریعہ تعلیم تھیں اور اعلی تعلیمی مدرسے ا۔ ہندو پاٹھ شالائیں، ۲۔ مسلم مدرسے۔ ابتدائی مدرسوں میں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا اور حساب کتاب کی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان اسکولوں کی اپنی کوئی عمارت نہیں ہوتی تھی۔ سامان بھی سادہ اور معمولی ہوتا تھا۔ یہ مدرسے اساتذہ کے گھروں، مساجد، مندروں میں یا کسی درخت کے نیچے تدریس کا کام کرتے۔ طلبہ کے استعمال میں آنے والی سلیٹیں اور پنسلیں مقامی طور پر تیار ہوتی تھیں۔ طالب علموں کی تعداد زیادہ سے زیادہ دس پندرہ ہوتی۔ وہ کبھی بھی داخلہ لے سکتے تھے اور اسکول میں جو کچھ سکھایا جاتا تھا اپنی استعداد کے مطابق سیکھ لیتے تو خود ہی مدرسہ چھوڑ دیتے تھے۔ سینئر لڑکے جونیئرز کو پڑھاتے تھے۔ یہ طریقہ تدریس پریسی ڈنسی کے ڈاکٹر چیپلن کو بہت پسند آیا اور انھوں نے اس طریق تدریس کو غریب بچوں کی تعلیم کے لیے انگلستان میں بھی متعارف کروایا۔ انگلستان میں یہ طریقہ مانیٹوریل سسٹم یا مدارس سسٹم کے نام سے مشہور ہوا۔ نصاب میں تحریری اور زبانی طور پر لکھنا پڑھنا، حساب کتاب اور بہی کھاتا شامل تھا۔ اسکولوں کی کوئی فیس نہیں ہوتی تھی۔ البتہ والدین اپنی استطاعت کے مطابق اساتذہ کو کچھ نقدی یا جنس کی صورت میں کچھ نہ کچھ معاوضہ ضرور ادا کرتے تھے۔[۲]

اعلیٰ تعلیمی مدرسے آج کل کے کالجوں سے ملتے جلتے تھے۔ ان مدرسوں میں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی جو اس زمانے میں اعلیٰ تعلیم سمجھی جاتی تھی اور ان مدرسوں کا مقصد مولوی اور پنڈت تیار کرنا ہوتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اپنے اپنے ادارے تھے اور انھیں راجوں مہاراجوں، نوابوں اور متمول لوگوں سے امداد ملتی تھی۔ تعلیم بلا معاوضہ اور ذریعہ تعلیم سنسکرت یا فارسی ہوتی تھی۔ طریقہ تعلیم روایتی ہوتا تھا۔ اساتذہ کو حکمرانوں کی طرف سے دیے گئے زمین کے عطیے، شاگردوں اور عام لوگوں کی طرف سے تحفے تحائف اور متمول گھرانوں سے کھانے پینے کی اشیا اور دیگر مراعات بطور معاوضہ دی جاتیں۔ اس کے برعکس کچھ ایسے اساتذہ بھی ہوتے تھے جو نہ صرف یہ کہ کچھ لیتے نہیں تھے بل کہ طالب علموں کے لیے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام بھی کرتے۔ ان اسکولوں کی بھی کوئی خاص عمارتیں نہیں تھیں۔ نوابوں، مہاراجوں اور دوستوں سے چندہ کرکے عمارتیں تعمیر کی جاتیں اور زیادہ تر کام مسجدوں اور مندروں کی عمارتوں سے چلایا جاتا۔ اکثر اوقات کسی خاص متمول یا سرپرست کے گھر پر بھی اسکول چلتا تھا۔ عام طور پر چھوٹی عمر میں بچے داخل ہو جاتے تھے اور اپنی مرضی کے مطابق جب تک چاہتے تعلیم حاصل کرتے۔ یہ مدت زیادہ تر بارہ سال یا اس سے بھی زیادہ پر محیط ہوتی۔ ہندو پاٹھ شالائیں صرف ہندو چلاتے اور ان میں برہمنوں کی اکثریت ہوتی۔ عورتوں اور ان ذاتوں کے لوگوں کو جنھیں مقدس کتابیں پڑھنے کا حق حاصل نہیں تھا داخلہ نہیں ملتا تھا۔ فارسی اور عربی مدرسوں کے معلم زیادہ تر مسلمان ہوتے تھے مگر ہندو اساتذہ بھی ہوتے

تھے اور عدالتی زبان فارسی ہونے کی وجہ سے بہت سے ہندو بھی ان مدرسوں میں پڑھتے تھے۔ بنگال کے بعض فارسی مدرسوں میں مسلمان طلبہ سے زیادہ تعداد ہندو طلبہ کی ہوتی تھی۔[۳]

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے قیام ۱۶۰۰ء کے بعد سے ۱۶۹۸ء تک ہندوستان میں تعلیم سے صرف نظر کیا۔ ۱۶۹۸ء میں ایک چارٹر ایکٹ کے ذریعے حکومت انگلیسہ نے یورپین ملازمین کے بچوں کے لیے اپنی چھاونیوں میں پادریوں اور اسکولوں کا نظام قائم کرنے کی ہدایات جاری کیں لیکن یہ انتظامات صرف یورپین ملازمین کے بچوں کے لیے تھے۔ ۱۷۵۷ء میں جب کمپنی نے ہندوستان میں حکومت کرنے کے اختیارات حاصل کر لیے تو انھیں عوام کے لیے جدید تعلیم کی روشنی پھیلانے کا خیال پیدا ہوا لیکن بعض سیاسی کش مکشوں کے تحت اس میں تاخیر ہوتی رہی۔ کمپنی ہندوستانیوں کی تعلیم کی ذمے داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی جب کہ ہندوستان میں کام کرنے والے بعض افسر سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے اس بات پر مصر تھے کہ کمپنی اس ذمے داری کو قبول کرے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ پادری تبلیغی سرگرمیوں کے لیے ہندوستان آنا چاہتے تھے مگر مقامی مخالفت کے خوف کی وجہ سے افسران پادریوں کے داخلے کے خلاف تھے۔ آخر کار ایک طویل دور کے بعد ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کی رو سے کمپنی کو ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے کچھ پیسہ صرف کرنے اور اپنے اپنے علاقے میں علم کی روشنی پھیلانے کے لیے پادریوں کے داخلے پر رضامند ہونا پڑا اور یوں برطانوی دور میں ریاستی نظام تعلیم کی ابتدا ہو گئی۔[۴]

۱۸۱۳ء کے بعد انگریزوں کا بڑا طبقہ جس کے نمائندے کے طور پر لارڈ میکالے کا نام لیا جاسکتا ہے، تعلیم کے ذریعے ہندوستانی تہذیب و تمدن کو مغربی تہذیب و تمدن میں تبدیل کرنے پر زور دیتا نظر آتا ہے۔ اس کا مطمح نظر ہندوستان میں ایک ایسی نسل کو فروغ دینا تھا جو رنگ اور نسل سے ہندوستانی لیکن سوچ اور خیالات کے لحاظ سے انگریز ہو۔ ایک گروہ ایسا بھی تھا جو ہندوستانی اور مغربی تہذیب کے امتزاج کے حق میں تھا لیکن اس تہذیب کا فروغ اسی صورت میں ممکن تھا جب کہ مغربی سائنس اور علوم کو ہندوستان کی کلاسیکل اور جدید مقامی زبانوں میں پڑھایا جائے لیکن ہوا یوں کہ بہت جلد انگریزی بہ حیثیت مضمون کی بجائے ذریعہ تعلیم بن گئی۔ ۱۸۵۴ء کو وڈز ایجوکیشن ڈسپیچ نے اعلان کر دیا کہ تعلیمی نظام کا اصل مقصد مغربی اور سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت ہے۔ البتہ کالج کی سطح پر مشرقی علوم کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے اور ثانوی طور پر انگریزی اور بول چال کی دیگر زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ دیا کہ حکومت مکمل طور پر تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتی اس لیے تعلیمی اداروں کی تنظیم کی ذمے داری مشنری اور ہندوستان کی نجی جماعتوں کے سپرد کرنی چاہیے۔[۵]

۱۸۵۴ء سے ۱۹۰۰ء کے دوران نظامِ تعلیم میں بہت تیزی سے مغربیت نفوذ کر گئی۔ دیسی اسکولوں کو تعصب اور نفرت کی بنا پر نظر انداز کیا گیا۔ کہیں کہیں ان اداروں کی ترقی کے لیے کوششیں ہوئیں مگر ان کے نتائج بھی اچھے ثابت نہیں ہوئے یعنی وہ ترقی کی بجائے تخریب کا باعث بن گئیں۔ مختلف طریقوں سے دیسی تعلیمی اداروں کی حوصلہ شکنی کی گئی جیسے کہ والدین کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنے بچوں کو دیسی اسکولوں سے نکال کر ڈپارٹمنٹ کے اسکولوں میں داخل کرائیں۔ نئے اسکولوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کی سرپرستی کی جاتی اور انھیں فوری طور پر سرکاری نوکریاں دلوائی جاتیں۔ اس طرح دیسی نظام تعلیم مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ ۱۹۰۰ء تک اعلیٰ تعلیم کے سارے اداروں نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنالیا اور مغربی و سائنسی علوم کی ترویج ان کا مقصد بن گئی۔[۶]

اگرچہ مغربی اور سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت میں بذات خود کوئی برائی نہیں تھی۔ مگر اس کا طریقہ کار غلط تھا۔ مغربی تعلیم کے مبلغین و منتظمین نے دیسی نظام تعلیم کو فنا کر کے مقامی لوگوں میں کمتری کا احساس پیدا کیا۔ مقامی زبانوں کو نظر انداز کیا گیا۔ ہندوستان کے کلچر کو تباہ کرنے کی کوشش کی گئی اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کو حقیر گردانا گیا۔ اس کی وجہ سے مقامی لوگوں میں آقاؤں کے خلاف نفرت کا احساس پرورش پانے لگا۔ ہندو مسلم اکثریت مغربی تعلیم کو قابلِ نفرین سمجھنے لگی اور بہت بعد تک انگریزی تعلیم عام افراد کی پہنچ سے دور رہی۔ شروع ہی سے دیکھا جائے تو حکومت نے تعلیم کی طرف توجہ مشنریوں کے دباؤ کی وجہ سے کی تاکہ وہ مقامی لوگوں کا مذہب تبدیل کریں اور حکومت کے افسران چاہتے تھے کہ انھیں مغربی تعلیم کے ذریعے ذہنی طور پر مغربی بنا دیا جائے۔ یعنی تعلیم کا مقصد جدید سائنسی علوم کی ترویج نہیں بل کہ تبدیلی مذہب اور مغربی کلچر کا فروغ تھا۔ تعلیمی ہند کے مرتبین لکھتے ہیں:

> حکومت ہائے سابقہ کے دور میں تعلیم کا نظام اس درجہ ہمہ گیر تھا کہ تقریباً ہندوستان کے ہر گاؤں میں مدرسے ہوا کرتے تھے اور عام طریقے پر بچے لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور اسی پر بس نہیں بل کہ انھیں مختلف فنون میں خاص مہارت ہوا کرتی تھی لیکن موجودہ حکومت کی انسان کش پالیسی نے اپنی شرم ناک اغراض یعنی مسلمانوں کو بدنام اور اپنی جڑیں مضبوط کرنے کی خاطر اس قدیم نظامِ تعلیم کو برباد کیا اور ان پرانے مدارس کو بالکل فنا کر دیا۔[۷]

جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان ہوا ہے کہ انگریزوں کی تعلیمی پالیسیوں کی وجہ سے ہندو مسلم عوام انگریزی تعلیم کے حق میں نہیں تھے بل کہ اسے بے دینی پھیلانے کا ذریعہ اور قابل نفرین سمجھتے تھے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ

مغربی اقوام ترقی یافتہ اور جدید سائنسی علوم سے بہرہ مند تھیں۔ بدلتے ہوئے دور میں یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی بھی قوم جدید اور سائنسی علوم حاصل کیے بغیر اپنی زندگی کو برقرار رکھ سکے۔ اس لیے اپنی قوم سے مخلص ہندو مسلم راہ نماؤں کا اس مسئلے کی طرف سنجیدگی سے غور و فکر کرنا ضروری تھا۔ جب ہم ہندوستان کی تاریخ دیکھتے ہیں تو ہمیں ہندو مسلم، دو شخصیات ایسی نظر آتی ہیں جنھوں نے اپنی قوم کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے میں پہل کی اور ان کی مساعی مشکور ہوئیں۔ یہ دو شخصیات راجہ رام موہن رائے اور سر سید احمد خاں ہیں کے ناموں سے اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ راجہ رام موہن رائے نے ہندو قوم کو جدید انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا اور ان کی قوم نے بہت جلد ان کی آواز پر لبیک کہا جب کہ سر سید احمد خاں کو خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

ہندوؤں کی جانب سے مغربی نظام تعلیم کو جلد قبول کر لینے کی وجوہات یہ تھیں کہ ہندو موقع شناس تھے۔ انھیں احساس تھا کہ وہ پہلے بھی مسلمان حکمرانوں کی رعایا تھے اور اگر وہ انگریزوں کی بالادستی کو قبول کر لیتے ہیں تو انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوسرا یہ کہ مغربی تعلیم حاصل کر کے وہ انگریز آقاؤں کے بہت قریب ہو کر اپنے مسلمان رقیبوں کو پچھاڑ سکتے تھے۔ وہ مغربی تعلیم کے بل بوتے پر اعلیٰ نوکریاں اور مرتبے حاصل کر کے نظام حکومت میں اچھا خاصا اثر و رسوخ حاصل کر سکتے تھے جب کہ مسلمان انگریزوں کو غاصب سمجھتے تھے جنھوں نے ان سے حکومت چھینی تھی اور انگریزی تہذیب و تمدن مسلم اکثریت کے نزدیک کافرانہ تھا اور اس کا نظام تعلیم بے دینی کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ تھا۔

راجہ رام موہن (۱۷۷۲ء۔ ۱۸۳۳ء) ہندو مصلح اور روشن خیال رہ نما تھے وہ انگریزی نظام تعلیم کے اس قدر شیدائی تھے کہ انھوں نے ۱۱/ ستمبر ۱۸۲۳ء کو گورنر جنرل لارڈ ایمبریسٹ کے نام ایک مراسلے میں سنسکرت کالج کے قیام کو مایوس کن قرار دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی ترقی انگریزی اور جدید سائنس ہی کے ذریعے ممکن ہے۔[۸] راجہ رام موہن نے اپنے انگریز ہم نواؤں اور سرپرستوں کے ساتھ مل کر ہندوستان میں مغربی تعلیمی اداروں کے قیام کے لیے مساعی جاری رکھیں۔ ان کی کوششوں سے ۱۸۱۷ء میں کلکتے میں ہندو کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۲۶ء میں ویدانت کالج کی بنیاد پڑی۔ وہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے فروغ کے لیے مشنری اور عیسائی اسکولوں سے استفادے میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں مغربی تعلیم کے اسکول کے لیے مشنری اسکولوں کی بھی حمایت کی اور نہ صرف حمایت کی بل کہ اپنے عوام کو ان اسکولوں میں داخلہ لینے کے لیے آمادہ بھی کیا۔ ان کی کوشش سے بنگال کے ہندو محلے میں الگیزنڈر ڈف مشنری اسکول قائم ہوا۔ ہئیر اسکول کے قیام میں بھی انھوں نے مدد کی۔ نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں کو جدید مغربی تعلیم ہر حال میں حاصل کرنا چاہیے اور اس کے حصول میں سرگرمِ عمل ہوجانا چاہیے۔چاہے وہ جس ذریعے سے حاصل ہو سکے۔اس لیے مشنری اسکول کے قیام میں بھی انھوں نے بنیادی اور کلیدی کردار نبھانے کی کامیاب کوششیں کی تھیں۔انھوں نہ صرف اسکول کے لیے نہ صرف مکان دلوایا تھا بل کہ اس کے لیے گھر گھر جاکر طالب علم بھی مہیا کیے تھے کیوں کہ ہندو علاقے میں طالب علم ملنا ایک بہت ہی کٹھن مسئلہ تھا۔[۹]

راجہ رام موہن نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کرائیں اور ان کی اس اپیل کا خاصا اثر ہوا۔البتہ جب بچوں کو اسکول میں بائبل کی کاپیاں تقسیم کی گئیں تو والدین میں تشویش پیدا ہوگئی کہ ہمارے بچوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی جارہی ہے مگر اس پر بھی راجہ رام موہن نے ہندوؤں کو قائل کرلیا کہ بائبل کی تعلیم میں کوئی حرج نہیں ہے کیوں کہ بائبل یا قرآن پڑھنے سے کوئی عیسائی یا مسلمان نہیں بن جاتا اور اس طرح انھوں نے اپنی تبلیغ سے ہندوؤں کے شکوک وشبہات دور کر دیے۔انگریز مشنری خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ ہندوستان میں انھیں کسی بھی ہندوستانی یا یورپین شخصیت کی نسبت سب سے زیادہ تعاون راجہ رام موہن رائے سے میسر آیا۔[۱۰] بہ ہر حال ہندوؤں میں مغربی تعلیم کے حصول کا شعور مسلمانوں کی نسبت بہت پہلے پیدا ہوچکا تھا اور انھوں نے اس میدان میں مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ کامیابیاں سمیٹ لی تھیں۔

دوسری طرف سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸) تھے جو مسلمانوں میں مغربی تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں تھے۔سر سید کو دہرے محاذ پر لڑنا تھا۔انگریز حکمران ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا قصوروار مسلمانوں کو قرار دیتے تھے اور انھیں امن دشمن اور بغاوت پسند سمجھتے تھے۔سر سید نے ایک تو انگریز حکمرانوں کو یہ باور کرانا تھا کہ مسلمان فسادی اور باغی نہیں ہیں اور جنگ آزادی کے تمام تر قصوروار مسلمان نہیں بل کہ اس میں انگریز حکومت کی اپنی کوتاہیاں بھی شامل ہیں۔دوسرا اپنی قوم کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مغربی علوم حاصل کرنے کے لیے تیار کرنا تھا۔چناں چہ انھوں نے مسلمانوں کو فی الحال ملکی سیاست سے دور رہ کر صرف اور صرف تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ہندو مغربی تعلیم حاصل کر کے ان سے بہت آگے نکل چکے ہیں اور انھوں نے انگریز حکمرانوں کی نظروں میں اپنا اعتماد بھی قائم کر لیا ہے۔اس لیے جب تک مسلمان جدید تعلیم سے مسلح نہیں ہوں گے انگریز حکمرانوں اور ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

سر سید نے اپنی ذاتی کوششوں سے ۱۸۷۵ء میں اسکول کھولا جو ۱۸۷۷ء میں کالج کا درجہ حاصل کر گیا اور آخر کار ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ان ہی کی تحریک و تشویق کے نتیجے میں سرحد میں اسلامیہ کالج، لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے اسکول اور کالج، کراچی میں مدرسہ اور بہت سے شہروں میں تعلیم کے ادارے کھلتے چلے گئے اور بہ تدریج مسلمانوں میں جدید تعلیم کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں سر سید کو مسلم عوام اور علما سے گالیاں بھی کھانی پڑیں، طعنے سہنے پڑے اور انھیں انگریزوں کا پٹھو کہا گیا۔ ادبی اخبارات میں نثر و نظم کی صورت میں ان پر طنز کیا جاتا مگر سر سید اپنے مقصد میں ڈٹے رہے۔ ان کی اس علمی تحریک و جدوجہد پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ نصابی کتب میں بھی ان کا تذکرہ عام ملتا ہے اور ان کی اس سعی کی بدولت تاریخ انھیں مسلمانانِ برصغیر کا بہت بڑا بہی خواہ اور مخلص فرد قرار دیتی ہے۔ تاہم سر سید کے بہت سے اقدامات ایسے ہیں جو ہمیشہ نامشکور رہے ہیں اور تاریخ و ادبی کتب نے جہاں سر سید کی مخلصانہ کوششوں اور کاوشوں کو سراہا اور اس بات کا اعتراف کیا کہ اگر سر سید نہ ہوتے تو شاید مسلمانان ہند جدید تعلیم سے بہت دیر تک بے بہرہ رہ جاتے، وہیں ادبی و تاریخی کتب میں ایسے بیانات بھی عام ملتے ہیں کہ:

> یہ ماننا پڑے گا کہ سر سید مغربی تہذیب کی چکا چوند سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے اور وہ انگریزی معاشرت و ثقافت کی بعض فروعات کے ایسے فریفتہ ہوئے کہ ان کی تحریک و تشویق دلاتے رہے۔"[11]

سر سید احمد خاں سمجھتے تھے کہ ان کے زمانے میں دینیات کی تعلیم بھی درست طریقے پر رائج نہیں تھی۔ لسانیات جس میں لغت صرف و نحو، معانی، بدیع اور انشا جن کا ذریعہ تعلیم فارسی تھا، ان کے خیال میں بذات خود علم نہیں تھے۔ منطق کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔ علم طبعی الٰہی ان کی زبانی "نہ لیپنے کا نہ پوتنے کا" کا رہا۔ علم حساب بھی مسلمانوں کے مدرسوں میں غیر مفید ہے۔ علم ہئیت اور علم آلات بھی مفید نہیں تھے۔ جو طب مسلمانوں میں رائج تھی ترقی کے بغیر بے سود تھی۔ دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کی علوم کی ترقی ختم ہو چکی ہے اور اس میں کوئی مفید علم مروج نہیں ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ تعصب چھوڑ کر اس علم کو اختیار کریں جو دین اور دنیا دونوں کے لیے فائدہ مند ہو۔[12]

سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کے احوال سے کتابوں کی کتابیں بھری پڑی ہیں یہاں ان کی تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس بات کی نشان دہی ناگزیر ہے کہ سر سید احمد خان تعلیمی معاملات میں پوری طرح راجہ رام موہن رائے کے مقلد نظر آتے ہیں۔ انھوں نے شروع میں مغربی تعلیم سے استفادے کے لیے سائنٹفک

سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد جدید سائنسی کتب کو اردو میں منتقل کرنا تھا تاکہ مسلمان عوام تک ان علوم کی رسائی زیادہ سے زیادہ ہو سکے ورنیکلریونی ورسٹی کے قیام کے لیے وہ ۱۸۶۶ء کی ایک عرض داشت میں یہ کہتے ہیں کہ کوئی قوم اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کیے بغیر ترقی نہیں کر سکتی مگر بعد میں ان کا رویہ اس قدر معذرت خواہانہ ہو جاتا ہے اور استدلال پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام عہدوں میں مشرقی علوم اور مشرقی زبان ختم ہو چکی ہے، سائنٹفک سوسائٹی کے دور میں ہم ترجموں سے کام چلا سکتے تھے مگر اب مجبور ہیں کہ انگریزی علوم انگریزی یا مغربی زبانوں ہی میں پڑھیں۔ یہی نہیں انھوں نے اپنے مضمون ہماری زبان اور ہماری اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں پنجاب یونی ورسٹی کو مشرقی علوم کی درس گاہ بنانے کی شدید مخالفت کی۔[۱۳]

مسلم حکومت کے قیام کے بعد سے ہندوستان بھر میں ہندو مسلم معاشرت کے اختلاط سے ایک مشترک زبان اردو کے عنوان سے وجود میں آچکی تھی جو مختلف لہجوں میں بڑی تیزی سے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی۔ اس زبان کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر ہندوؤں نے تنازعات بھی کھڑے کیے۔ سنسکرت تو پہلے ہی پنڈتوں تک محدود تھی بعد میں دیگر زبانیں بھی اردو کے مقابلے میں اپنی مقبولیت گنوا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اردو مسلمان حکمرانوں کی زبان تھی اس لیے راجہ رام موہن کو فرق نہیں پڑتا تھا کہ ہندو مقامی زبانوں اور اردو زبان میں تعلیم حاصل کریں جو مسلمانوں کی زبان تھی یا انگریز حکمرانوں کی زبان جو وقت کی ضرورت بھی تھی، مگر سرسید کا انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کی حمایت کا فیصلہ اور اردو زبان کو مغربی علوم کا بوجھ اٹھانے کے لیے کمزور قرار دینا یقیناً درست نہیں تھا۔ سرسید کی تحریک کے نتیجے میں انگریزی زبان کے توسط سے انگریزی کلچر پوری طرح پڑھے لکھے مسلمانوں میں نفوذ کر گیا۔ لہٰذا جہاں وقت کے تقاضوں کے مطابق انگریزی تعلیم تھی وہیں کچھ عرصے کے بعد اس کے نتائج دیکھتے ہوئے اسی نظام تعلیم کے پروردہ مخلص مسلمان راہ نما اس کے نقاد بن گئے جن میں سب سے مضبوط اور مدلل آواز علامہ محمد اقبال کی تھی۔

مغربی تعلیم اپنے تمام تر تہذیبی اثرات اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ اس نظام تعلیم کی تمام تر بنیاد مادیت اور محض عقل پرستی پر تھی۔ نظر آنے والے اور ٹھوس حقائق جن کا انحصار حواس خمسہ پر ہو اس تعلیم کا مطمح نظر تھے۔ یہ تعلیم نظر آنے والے خداؤں کی عبادت کرنے والے ہندوؤں کے لیے تو پھر بھی خوش گوار ہو سکتی تھی لیکن ایک ایسی قوم کے لیے جس کی تعلیم و تربیت کی اصل بنیادیں ہی غیب پہ ایمان پر اٹھائی گئی ہوں، کیسے مفید ہو سکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ تجرباتی سائنس کو دنیا میں متعارف کرانے والے مسلمان ہی تھے مگر اسلامی تعلیمات میں جسم اور روح دونوں کی حقیقت کو مدِ نظر رکھا گیا تھا۔ روح کے بغیر انسانی جسم کی حقیقت محض ایک

مردے کی ہے۔ اس لیے اسلام انفس و آفاق ہر دو کی تسخیر کا حکم صادر کرتا ہے۔ مغربی تہذیب چوں کہ روح کی اہمیت کی انکاری تھی اس لیے اسی دنیا کو جو ظاہری آنکھ سے نظر آتی ہے اور ان ہی چیزوں کو جنھیں حواسِ خمسہ کی مدد سے درک کیا جاسکتا ہے سب کچھ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب میں اخلاقیات کی جنازہ نکل گیا۔ مغربی قومیں مذہب کو خدا حافظ کہہ کر تاجرانہ مقاصد کے لیے ایک دوسرے سے بر سرپیکار ہوئیں اور نوآبادیات قائم کر کے غیر ترقی یافتہ اقوام کو غلام بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ قومیں جنھوں نے ان کے مقاصد کو پہچان لیا اور ان کے سامراجی عزائم کے سامنے بند باندھ دیے وہ بہت کم عرصے میں دنیا میں سرخ رو ہو گئیں جن میں اول جاپان اور پھر چین کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ مگر جن قوموں نے سامراجیت کی درست طور پر تشخیص کر کے ایک موثر حکمت عملی اختیار نہیں کی وہ آج بھی خستہ حال ہیں۔

ہندوؤں میں راجہ رام موہن اور مسلمانوں میں سر سید کی مشرقی علوم اور مدارس کی مخالفت اور مغربی تہذیب میں رچ بس جانے کا جو نقصان ہوا اس کی تلافی تاحال نہیں ہو سکی اور آئندہ بھی اگر اس کے خلاف موثر حکمت عملی نہ بنائی گئی تو شاید یہ صورت حال کئی نسلوں تک جاری رہے۔ مغربی تعلیم و تربیت نے جہاں ہندو مسلم سماج میں سائنسی شعور بیدار کیا وہیں انھیں نفسیاتی طور پر ذہنی غلامی کے ایسے شکنجے میں جکڑ لیا جس سے آزادی حاصل کرنا جسمانی غلامی کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل اور کٹھن ہے۔ اس تعلیم کے سبب ہندو مسلم اپنی مذہبی روایات، اخلاقیات سے بے بہرہ ہوتے چلے گئے۔ خوب و ناخوب میں فرق کرنے سے محروم ہو گئے۔ فرنگی سے مستعار لیے ہوئے اس نظامِ تعلیم نے ہوس اور مے خواری و عریانی کو فروغ دیا اور مذہب و اخلاقیات سے بغاوت کو جدیدیت کا نام دیا۔ مغربی تعلیم کے ذریعے سائنسی علوم کی نسبت ان کی تہذیب کو ہمارے ہاں زیادہ فروغ ہوا۔ اس کے مقابلے میں جاپانیوں کی تاریخ دیکھیں تو انھوں نے مغربی تہذیب کے سامنے اپنی تہذیب کو بھینٹ چڑھنے دیا نہ ہی اپنی زبان کو، انھوں نے اسی کام سے ابتدا کی جو سر سید نے سائنٹفک سوسائٹی کے عنوان سے شروع کیا تھا اور آخر کار کامیابیاں سمیٹتے چلے گئے جب کہ سر سید یہاں ٹھوکر کھا گئے۔

مغربی تعلیم میں اخلاقی تربیت کا کوئی نظام نہیں تھا۔ غلامی اور اندھی تقلید کی وجہ سے مدرسہ اور اہل مدرسہ جذبہ شوق و عمل سے محروم ہو چکے تھے۔ سامراجیوں کا پیدا کردہ تعلیمی ماحول پاک و ہند کے جوانوں میں آزادی و حریت کی روح پھونکنے کی بجائے ان میں مایوسی، بے عملی اور محرومی کا احساس بیدار کر رہا تھا۔ تعلیم کا مقصد محض ملازمتوں اور کرسیوں کا حصول رہ گیا تھا۔ واضح رہے کہ جب ہندوستان میں سامراجی نظام حکومت قائم ہوا اور مشرقی علوم کی بیخ کنی کی گئی تو انھی لوگوں کو ملازمتیں ملتی تھیں جو انگریزی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ مقصد جو آغاز

سے برصغیر کے باشندوں کے لیے قرار پایا جوں کا توں بر قرار ہے۔ مغربی نفوذ کے بعد تعلیم اور نظام تعلیم کا جو حال ہوا فرمان فتح پوری کے الفاظ میں دیکھیے:

> تعلیم کیا ہے، شاہین بچوں کو کرگس بنانے کا فن ہے۔ اس تعلیم کے سبب نوجوان یاس و محرومی کا شکار ہو گئے ہیں، نہ ان میں جوشِ عمل ہے، نہ جذبہ خود داری۔ نظام کیا ہے؟ مذہب و اخلاقیات کے خلاف ایک سازش ہے۔ پڑھانے والوں میں نہ افکار کی ندرت ہے، نہ خیالات کی جدت اور نہ علم کی گہرائی۔ یہی حال پڑھنے والوں کا ہے۔ نہ ان میں تحصیل علم کی لگن ہے، نہ حقائق کی جستجو، نہ تعمیر خودی کا ذوق وشوق، تجدید و ایجاد کے بجائے ہر بات میں مغرب کی تقلید کا اثر نمایاں ہے۔"[۱۴]

اس دور میں مغربی نظام تعلیم کی خرابیوں کی نشان دہی کرنے میں سب سے زیادہ شدید آواز علامہ محمد اقبال کی نظر آتی ہے۔ علامہ نے اپنی نظم و نثر میں سامراجی نظام تعلیم کے اثرات و نتائج کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ صرف اردو کلیات سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آزرانہ[۱۵]

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا[۱۶]

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام[۱۷]

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظام تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف[۱۸]

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس[۱۹]

علامہ محمد اقبال کے تعلیمی نظریات کی تفصیل ایک علاحدہ موضوع ہے جس کے لیے ایک مفصل مقالہ درکار ہے۔ یہاں درج بالا اشعار اقبال کے موقف کے حوالے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں جن میں سامراجی تعلیم اور نظام

تعلیم پر تنقید کو سمجھنا مشکل نہیں۔ اقبال نے اپنی نثر میں تعلیمی خود داری کے سلسلے میں جاپانیوں سے رجوع کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ سر راس مسعود جو اقبال کے قریبی دوستوں میں سے تھے بعید نہیں کہ اقبال ہی کے مشورے پر تعلیمی نظام کا جائزہ لینے کے لیے جاپان گئے ہوں۔ انھوں نے اس پر ایک مفصل بھی رپورٹ بھی انگریزی زبان میں تحریر کی جو کہ اردو میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اگر ہندوستان کے تعلیمی منظر نامے کا مفصل جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ انگریزی تعلیم و تہذیب کی چکاچوند میں راجہ رام رموہن اور سر سید احمد خاں سے جو غلطی سرزد ہوئی وہ قوم کو اس کی خودی سے محروم کر دینے کی تھی۔ ہندوؤں کے لیے تو ہو سکتا ہے اس میں بچت کا کوئی خفیہ پہلو نکلتا بھی ہو لیکن مسلمانوں میں حق میں خودی سے محرومی، بہ حیثیت قوم ان کی ہستی کو مکمل طور پر مٹا دینے کے مترادف تھی۔ اگر بات محض انگریزی سائنسی تعلیم سے اخذ و استفادے تک محدود رہتی اور اسے بذریعہ تعلیم مسلم اذہان پر ثقافتی و سماجی طور پر مسلط نہ کیا جاتا تو نتیجہ وہی ہوتا ہے جاپان اور پاکستان کے بعد آزادی حاصل کرنے والے چین کی صورت میں سامنے آیا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت نے یا تو انگریزی تعلیم کو مزحمتی طور پر یکسر رد کر دیا یا پھر اس کے ذریعے مغربی ثقافت کو اپنایا جب کہ مغربی کی ترقی اس کی مادی ثقافت کی نہیں بل تجرباتی سائنس کی بنیاد پر تھی۔ آج بھی سماجی طور پر دیکھا جائے تو واضح طور پر نظر آتا ہے کہ مغربی ثقافت کی یلغار نے مسلم معاشرے سے حرکت و عمل کی وہ تمام طاقت سلب کر لی ہے جو قرآنی تعلیمات کا طرہ امتیاز ہے۔ اقبال کا موقف ہے کہ:

> ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف آج تجربہ ہم سے کرا رہا ہے، نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احدے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنالینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔[۲۱]

اسی مضمون میں اقبال نے اعتراف کیا ہے کہ: ”وہ لوگ جنھوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچے کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے وہ ہمارے مقابلے میں قوم کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ آگاہ تھے“۔[۱۶] اقبال کے نزدیک اسلام بذات خود ایک ایسی ثقافت ہے جس میں تعلیم و تعلم، تہذیب و تمدن، سیاست و معاشرت، معیشت و اقتصاد ایک ضابطے کے تحت ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے اسلامی ثقافت پر کسی

دوسری ثقافت کے حاوی ہو جانے کا مطلب اسلامی سیرت سے محرومی ہے اور اسلامی سیرت سے محرومی نے اس ضابطہ حیات کو کمزور کر دیا ہے جس نے بہ حیثیت قوم مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ترقی کی ضمانت ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ محمد عمر، ہند اسلامی سماج۔ تہذیبی لین دین، مشمولہ ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا، مرتبہ عماد الحسن آزاد فاروقی، ص:۳۵
https://www.rekhta.org/ebooks/hind-islami-tahzeeb-ka-irtiqa-tahzeebi-len-den-aur-funoon-e-lateefa-ebooks بتاریخ ۱۰ فروری/ ۲۰۲۲ بوقت ۱۱ بجے دن

۲۔ نوراللہ، سید، تاریخ تعلیمِ ہند (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۲)، ص:۵۰۔۵۱

۳۔ ایضاً، ص:۴۸۔۹۵

۴۔ ایضاً، ص:۱۲

۵۔ ایضاً، ص:۱۳

۶۔ ایضاً، ص:۱۴

۷۔ اراکینِ مجلس قاسم المعرف دیوبند، تعلیمی ہند، ص:۶
https://www.rekhta.org/ebooks/taleemi-hind-ebooks-1 : بتاریخ ۱۴ فروری، بوقت ۱۱ بجے دن

۸۔ اعظمی، ایم نسیم، ڈاکٹر راجہ رام موہن رائے اور ان کے تحریکی و تعلیمی کارنامے، ص:۲۷۳
https://www.rekhta.org/ebooks/raja-ram-mohan-rai-aur-unke-tahriki-o-talimi-karname-m-nasim-aazmi-ebooks، بتاریخ 24 فروری،، دن ۱۰ بجے

۹۔ ایضاً، ص:۲۸۸

۱۰۔ ایضاً، ص:۸۸۔۸۹

۱۱۔ رومان، انور، پروفیسر، اقبال اور مغربی استعمار، (لاہور: بزمِ اقبال، مئی/ ۱۹۹۶ء)، ص:۲۴

۱۲۔ صدیقی، ایم علی، ڈاکٹر، سر سید احمد خاں اور جدت پسندی، ص:۸۱۔۸۲
www.rekhta.org/ebooks/sir-sayyed-ahmad-khan-aur-jiddat-pasandi-mohammad-ali-siddiqi-ebooks، بتاریخ یکم مارچ/ ۲۰۲۲ء، دن ۴۲:۹۰

۱۳۔ ایضاً، ص:۸۶

۱۴۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص:۱۳۵

۱۵۔ اقبال، کلیاتِ اقبال، اردو، (لاہور: اقبال اکادمی، اشاعت ششم، ۲۰۰۴ء)، ص:۳۵۳

۱۶۔ ایضاً، ص:۳۶۸

۱۷۔ ایضاً، ص:۵۹۵

۱۸۔ ایضاً، ص:۵۹۹

۱۹۔ ایضاً، ص:۶۸۲

۲۰۔ دیکھیے، مسعود، سر راس جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق مترجم، محمد عنایت اللہ (دہلی: انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۲۸ء)

۲۱۔ اقبال، ''مشمولہ''، مق، ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر، مقالاتِ اقبال مرتبہ عبدالواحد معینی (لاہور: شیخ محمد اشرف پرنٹر پبلشرز، مئی/ ۱۹۶۳ء)، ص:۱۳۲

۲۲۔ ایضاً، ص:۱۳۳

Abstract

Since 1600 to 1698, the East India Company took no interest in the field of education of India. For the first time in 1698, the Company through an Act started establishing schools in its cantonments for the children of their Europeans officers. In 1755, the Company has its intention to spread Education even among the people of India. In 1813, the Company through its charter agreed to invest in Education under its system of states. This article discusses the education in India since 1813 for which Lord Macaulay had a key role to play. In 1854, Wood's Education Dispatch announced that the main objective of Education was to enforce European and Scientific education. In the beginning of the twentieth century, Allama Iqbal criticised the conception of European education through his prose and poetry.

Keyword: The East India Company, Wood's Education Dispatch, Lord Macaulay, Allama Iqbal, concept of European education